

القاب ملتے ہیں۔ وہاں دنیوی زندگی کیلئے ”متاع الغرور“ کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ اور ان سب چیزوں کیلئے ”الدنیا“ کا لفظ ملتا ہے، جو اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے کچھ اچھا تاثر نہیں دیتا اور قرآن کریم کے مجموعی اصول سے بھی اسکی دناوت اور حقارت سمجھ میں آتی ہے۔

کوتاہ نظری اس موقع پر تضاد کا شبہ پیدا کر سکتی ہے لیکن درحقیقت اس کے پیچھے اہل رازیہی ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی رہگزر کے مرحلے ہیں۔ اسکی اصل منزل درحقیقت ان سے آگے ہے، اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود۔ انسان کا اصل مسئلہ اور اسکی زندگی کا بنیادی مقصد انہی دو منزلوں کی تحصیل ہے۔ لیکن چونکہ ان دو منزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گزرے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے وہ تمام چیزیں بھی انسان کیلئے ضروری ہو جاتی ہیں جو اسکی دنیوی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ جب تک وسائل معاش انسان کی اصلی منزل کے لئے رہگزر کا کام دیں وہ ”فضل اللہ“ ”خیر“ ”زینۃ اللہ“ اور ”سکن“ ہیں۔ لیکن جہاں انسان اسی رہگزر کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جائے اور اس پر اپنی اصل منزل مقصود کو قربان کر ڈالے یا بالفاظ دیگر وسائل معاش کو ”رہگزر“ بنانے کی بجائے اپنی منزل مقصود کے راستے میں رکاوٹ بنا دے تو پھر یہی وسائل معاش ”متاع الغرور“ ”فتنہ“ اور ”عدو“ بن جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے ایک مختصر جملے ”دابتغ فی مآلاتک اللہ الدار الاخرۃ“ میں اس بنیادی حقیقت کو بیان فرمایا ہے اس کے علاوہ اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں، اہل علم کے سامنے تمام آیات کو ذکر کرنیکی ضرورت نہیں۔ احقر کی رائے میں ”انسانی معاش“ کے متعلق قرآن کریم کی یہ روش اور اس کے دو مختلف پہلو نظریں رہیں تو اسلامی معاشیات کے بہت سے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

دولت اور ملکیت کی حقیقت | دوسری بنیادی بات جو خاص طور سے ”تقسیم دولت“ کے مسئلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق ”دولت“ خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ کی پیدا کردہ اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی عطا ہے ہوتا ہے۔ سورہ نور میں قرآن کریم کا ارشاد ہے :

وَاتُؤْتَم مِّن مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡا کُم۔ اور انہیں اللہ کے مال میں سے دو جو اس نے

تم کو عطا کیا ہے۔

...

اس کی وجہ بھی قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بتلا دی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتا ہے کہ عمل پیدائش میں اپنی کوشش صرف کرے۔ لیکن اس کوشش کو بار آور کرنا اور اس سے پیداوار کا مہیا کرنا خدا کے سوا کون کر سکتا ہے۔ انسان کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دے لیکن اس بیج کو کوہل اور کوہل کو درخت بنانا تو کسی اور ہی کا کام ہے۔ ارشاد ہے :

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرثُونَ أَأَنْتُمْ تَزِدُّونَهُ
أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ - دیکھو تو جو کچھ تم کاشت کرتے ہو۔ کیا تم اسے
اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے۔

نیز ارشاد ہے :

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَا خَلَقْنَا لَهُمْ مَا مِثْلَهُ
أَيَّدِينَا النَّحَامَ فَنَظَّمْنَاهُمْ لَهَا مَالِكُونَ - کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے
جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پیدا کیا۔ پھر وہ
اس کے مالک بن گئے۔

یہ تمام آیات اس بنیادی نکتے پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں کہ دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، اور اسی کی عطا سے انسان کو ملی ہے۔ پھر اسلام کی نظر میں چونکہ ”دولت“ پر اصل ملکیت اللہ کی ہے اور اس نے انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق عطا کیا ہے اس لئے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو اپنی مرضی اور مصالح عالم کا پابند بنائے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر ملکیت ”تو حاصل ہے۔ مگر یہ ملکیت آزاد خود مختار اور بے لگام نہیں ہے۔ اس پر ”دولت“ کے اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود قیود اور پابندیاں عائد ہیں جس جگہ وہ اس دولت کو خرچ کرنے کا حکم دے دے وہاں اس کے لئے خرچ کرنا ضروری ہے اور جہاں خرچ کی ممانعت کر دے، وہاں رک جانا لازم ہے۔ اسی بات کو سورہ قصص میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے۔

وَاتَّبِعْ نِيهَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ
وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ نَفْسِكَ مِنَ الدُّنْيَا
مَا حَسَنَ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ
وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ نَفْسِكَ مِنَ الدُّنْيَا
يُوحِثُكَ اللَّهُ نَفْسِكَ
(آخرت) کا ترشہ کمانے اور دنیا سے اپنا حق
نہ بھول اور بھلائی کو جیسے اللہ نے تجھ سے
بھلائی کی اور ملک میں خرابی ڈالنی مت چاہ۔

اس آیت نے اسلام کے فلسفہ ملکیت کو خوب کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ اس سے مندرجہ ذیل ہدایات واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ انسان کے پاس جو کچھ دولت ہے وہ اللہ کی دی ہوئی ہے۔ (آتاکَ اللَّهُ)

۲۔ انسان کو اس کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ اسکی منزل مقصود دار آخرت ہو۔ (واتبع.....
...الدار الاخرۃ)

۳۔ چونکہ دولت اللہ کی دی ہوئی ہے۔ لہذا اس پر انسان کا تصرف حکم خداوندی کے تابع ہوگا
اب حکم خداوندی کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم دے کہ یہ مال کسی
دوسرے کو دیدو۔ اس کی تعمیل اس لئے ضروری ہے کہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے۔ تو
وہ تمہیں دوسرے پر احسان کا حکم دے سکتا ہے۔ (واحسن کما احسن اللہ الیک)

۴۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ تم کو اس دولت کے کسی تصرف سے منع کرے۔ اس کا بھی اسکو
اختیار ہے۔ کیونکہ وہ تمہیں دولت کے کسی ایسے استعمال کی اجازت نہیں دے سکتا،
جس سے اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں اور زمین میں شر و فساد پھیلے۔ (دلتبع الفساد
فی الارض)

یہی وہ چیز ہے جو اسلام کو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے نظریہ ملکیت سے
ممتاز کرتی ہے۔ سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر چونکہ نظری یا عملی طور پر مادیت ہے۔ اس لئے اس کے
نزدیک انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے۔ وہ اسکو جس طرح چاہے رکھ
سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے قوم شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے اس نظریہ
کا مذمت کے پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ وہ لوگ کہا کرتے تھے۔

اصلا نکت تاملک ان نترک	کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ
ما یعبدا آباءنا وان نفعنا	ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں
فی اموالنا ما نشاء	یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف
(سورۃ ہود)	کرنا ترک کر دیں۔

وہ لوگ چونکہ ”اموال“ کو حقیقتہً اپنا (اموالنا) سمجھتے تھے اس لئے ”نفعنا ما نشاء“ (جو چاہیں کریں)
کا دعویٰ اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ یہی فکر سرمایہ داری کی روح ہے۔ اور قرآن کریم نے سورۃ نور میں
”اموالنا“ (اپنے اموال) کے لفظ کو ”مال اللہ“ (اللہ کا مال) سے بدل کر سرمایہ دارانہ فکر کی اس
بنیاد پر ضرب لگائی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ”الذی آتاکم“ (جو تمہیں دیا ہے) کی قید لگا کر اشتراکیت
کی بھی جڑ کاٹ دی ہے۔ جو سرے سے انسان کی انفرادی ملکیت ہی کا انکار کرتی ہے۔ اسی طرح
سورہ یسین کی آیت ”فہم لہا مال کون“ نے بذریعہ عطاء حق تعالیٰ انفرادی ملکیت کو واضح کر دیا ہے۔

اب اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان واضح خط امتیاز اس طرح کھینچا جاسکتا ہے کہ :

سرمایہ داری — آزاد اور خود مختار انفرادی ملکیت کی قائل ہے۔

اشتراکیت — انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کرتی ہے۔

اور حق ان دو انتہاؤں کے درمیان ہے۔ یعنی :

اسلام — انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ مگر یہ ملکیت آزاد اور خود مختار نہیں

جس سے "فساد فی الارض" پھیل سکے۔

تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد | اسلام نے تقسیم دولت کا جو نظام مقرر کیا ہے۔ اور جس کا

حاکم انشاء اللہ آگے پیش کیا جائے گا۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے اس کے تین مقاصد معلوم ہوتے ہیں :

الف۔ ایک قابل عمل نظام معیشت کا قیام — تقسیم دولت کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے

کہ اس کے ذریعہ دنیا میں معیشت کا ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جو فطری اور قابل عمل ہو۔

اور جس میں ہر انسان جبر و تشدد کی بجائے قدرتی طور پر اپنی لیاقت، اپنی استعداد، اپنے

اختیار اور اپنی پسند کے مطابق خدمات انجام دے۔ تاکہ اس کی خدمات زیادہ موثر،

مفید اور صحت مند ہوں۔ اور یہ بات مستاجر (جسے مروجہ معاشی اصطلاح میں آجر

کہا جاتا ہے) اور "آجر" کے صحت مند رشتے اور "رسد" و "طلب" کی فطری قوتوں

کے صحیح استعمال کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اسلام نے انہیں تسلیم کیا ہے۔

۱۔ اس بات کی طرف مندرجہ ذیل آیات میں جامع اشارہ فرمایا گیا ہے :

ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دینی

زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو

بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی

ہے۔ تاکہ انہیں سے ایک دوسرے سے کام

لے سکے۔

نحن قسمنا بينهم معيشتهم

في الحياة الدنيا ورفعنا بعضهم

فوق بعض درجات ليتخذ

بعضهم بعضا سخریا

...

لئے صحیح استعمال کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ان قوتوں کا غلط استعمال بھی ممکن ہے اور سرمایہ داری

میں ہوتا رہا ہے۔ اسلام نے انفرادی ملکیت کی بے لگائی کو ختم کر کے اس غلط استعمال کی بیخ کنی کی ہے۔

بے۔ حق کا حقدار کو پہنچانا۔ اسلام کے نظام تقسیم دولت کا دوسرا مقصد حق کا حقدار کو پہنچانا ہے۔ لیکن اسلام میں استحقاق کا معیار دوسرے نظام ہائے معیشت سے قدرے مختلف ہے۔ مادی معاشیات میں دولت کے استحقاق کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے اور وہ ہے عمل پیدائش میں شرکت، جتنے عوامل دولت کی پیداوار میں شریک ہوتے ہیں، انہیں کو دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اور بس! اس کے برخلاف اسلام کا بنیادی اصول چونکہ یہ ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور وہی اس کے استعمال کے قوانین مقرر فرماتا ہے اس لئے اسلام میں دولت کے حقدار صرف عاملین پیدائش ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ شخص بھی دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہنچانا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے۔ لہذا فقراء و مساکین اور معاشرے کے نادار اور بیکس افراد بھی دولت کے حقدار ہیں، اس لئے کہ جن عوامل پیدائش پر اولاً دولت تقسیم ہوتی ہے ان کے ذمے اللہ نے لازم کیا ہے کہ وہ ان تک اپنی دولت کا کچھ حصہ پہنچائیں اور قرآنی تصریحات کے مطابق یہ مفلسوں اور ناداروں پر ان کا کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ وہ فی الواقعہ دولت کے مستحق ہیں۔ ارشاد ہے:

فی اموالہم حق معلوم
للسائل والمحدوم۔

اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک
متعین حق ہے۔

اس حق کو بعض مقامات پر اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے۔ کھیتیوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے:

والتواحقہ یوم حصادہ۔ اور اس (کھیتی) کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔

ان دونوں آیتوں میں "حق" کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ استحقاق دولت کا ماخذ صرف عمل پیدائش ہی نہیں ہے بلکہ مفلس و نادار افراد بھی دولت کے بھٹیک اس طرح مستحق ہیں جس طرح اس کے اولین مالک۔ لہذا اسلام دولت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے کہ اس سے تمام عوامل پیدائش کو ان کے عمل کا حصہ بھی پہنچ جائے اور اس کے بعد ان لوگوں کو بھی ان کا حصہ مل جائے جنہیں اللہ نے مستحق دولت قرار دیا ہے۔ (ان دونوں قسم کے حقداروں کی تفصیل آگے انشاء اللہ آئے گی)

ج۔ ارتکاز دولت کی بیخ کنی۔ تقسیم دولت کا تیسرا مقصد جسکو اسلام نے بہت اہمیت دی ہے یہ ہے کہ دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کی بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کر دے۔ اور اس طرح امیر و غریب کا

تفاوت جس حد تک فطری اور قابل عمل ہو کم کیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کا طرز عمل یہ ہے کہ دولت کے جو اولیں ماخذ اور دہانے ہیں ان پر اس نے کسی فرد یا جماعت کا پہرا نہیں بیٹھنے دیا بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو ان سے استفادے کا مساوی حق دیا ہے، کائناتیں جنگل اور غیر ملوکہ بجز زمینیں جنگل اور پانی کا شکار، خود رو گھاس، وریا اور سمندر، مالی غنیمت وغیرہ یہ تمام پیداوار دولت کے اولیں ماخذ ہیں، اور ان میں ہر فرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان سے اپنے کسب و عمل کے مطابق فائدہ اٹھائے اور اس پر کسی کی اجارہ داری قائم نہ ہو۔

کیلا یكون دولة بين الاغنياء تاکہ (یہ دولت) تم میں سے (موت) مالداروں

منکم

کے درمیان دائر ہو کر نہ رہ جائے۔

اس کے بعد جہاں انسانی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور کوئی شخص اپنے کسب و عمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو وہاں اس کے کسب و عمل کا احترام کر کے اس کی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اس میں ہر ایک کو اس کے کسب و عمل کے مطابق حصہ دیا گیا ہے۔ اور اس معاملے میں ارشاد یہ ہے کہ:

نحن قسمنا بينهم معيشتهم ورفعا ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو تقسیم

بعضهم فوق بعض درجات ليتخذ کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات

بعضهم بعض سخريا۔ کی فوقیت دی ہے تاکہ ایک دوسرے سے

کام لے سکے۔

لیکن درجات کے اس فرق کے باوجود کچھ ایسے احکام دیدے گئے ہیں کہ یہ فرق اس قدر ہے جتنا ایک قابل عمل نظم معیشت کے قیام کے لئے ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت کا ذخیرہ صرف چند ہاتھوں میں سٹار ہے۔

تقسیم دولت کے ان تین مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے متاثر کرنا ہے۔ تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے اور دوسرا دونوں سے جس کی تفصیل عنقریب عرض کی جائے گی۔

اسلامی نظم معیشت کے ان چند بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب میں مختصراً

لے واضح رہے کہ یہ آیت مال غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جو حصول دولت کے اولین

ماخذ میں سے ہے۔

تقسیم دولت کا وہ نظام بیان کرنے کی کوشش کروں گا جو قرآن و سنت اور فقہ امت کی کاوشوں سے سمجھ میں آتا ہے۔

تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ | اسے پوری طرح سمجھنے کیلئے سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ”تقسیم دولت“ کا جو نظام مقرر کیا گیا ہے پہلے اس پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ مختصر لفظوں میں اس نظریے کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ دولت انہی لوگوں پر تقسیم ہوتی چاہئے جنہوں نے اسکی پیداوار میں حصہ لیا ہے۔ اور جنہیں معاشی اصطلاح کے مطابق ”عاملین پیداوار“ کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشیات میں یہ کل چار عوامل ہیں۔

۱۔ سرمایہ — جسکی تعریف ”پیدا کردہ ذریعہ پیدائش“ سے کی گئی ہے۔ یعنی وہ شے جس پر ایک مرتبہ انسانی عمل پیدائش ہو چکا ہو۔ اور اسے ایک دوسرے عمل پیدائش کے لئے ذریعہ بنایا جاتا ہو۔

۲۔ محنت — یعنی انسانی عمل۔

۳۔ زمین — جس کی تعریف ”قدرتی وسائل“ سے کی گئی ہے۔ یعنی وہ اشیاء جو انسان کے کسی سابقہ عمل پیدائش کے بغیر پیدائش کا وسیلہ بن رہی ہوں۔

۴۔ آجریا منتظم، یعنی وہ جو محتا عامل جو مذکورہ بالا تینوں عوامل کو جوڑ کر انہیں کام میں لگاتا اور نفع و نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ان چار عاملین پیداوار کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوتی ہے۔ اسکو انہی چاروں پر اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک حصہ سرمایہ کو سود کی شکل میں دیا جاتا ہے، دوسرا حصہ محنت کو اجرت کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ تیسرا حصہ زمین کو رگان یا کرایہ کی صورت میں ملتا ہے۔ اور چوتھا حصہ آجریہ کے لئے منافع کی صورت میں باقی رکھا جاتا ہے۔

تقسیم دولت کا اشتراکی نظریہ | اس کے برخلاف اشتراکی معیشت میں چونکہ سرمایہ اور زمین کسی کی انفرادی ملکیت ہونے کی بجائے قومی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس لئے سود اور رگان کا اس نظام کے فلسفے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آجریہ بھی اشتراکی نظام میں کوئی فرد واحد ہونے کی بجائے

ملکہ ہمارے واضح رہے کہ اس وقت گفتگو اشتراکیت کے اصل فلسفے سے ہو رہی ہے اس کے موجودہ عمل سے نہیں۔ اشتراکی مالک کا موجودہ طریقہ عمل اس فلسفے سے بہت مختلف ہے۔

خود حکومت ہوتی ہے، اس لئے منافع بھی اس کے یہاں نظری طور پر خارج از بحث ہے۔ اب صرف "محنت" رہ جاتی ہے۔ اور اشتراکی نظام میں دولت کی وہی مستحق ہے جو اسے "اجرت" کی شکل میں ملتی ہے۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظریہ | اسلام کا نظام تقسیم دولت ان دونوں سے مختلف ہے اس کے نزدیک دولت کے مستحقین دو قسم کے ہیں۔ ایک اولین مستحق، یعنی وہ لوگ جو کسی عمل پیدائش کے بعد بلا واسطہ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ مستحقین وہی عوامل پیداوار ہیں جنہوں نے کسی پیداوار کے عمل پیدائش میں حصہ لیا۔ دوسرے ثانوی مستحقین یعنی وہ لوگ جو براہ راست عمل پیدائش میں شریک نہیں تھے۔ لیکن عاملین پیدائش کے ذمے لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کریں۔ یہاں مستحقین دولت کی ان دونوں قسموں کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

دولت کے اولین مستحق | جیسا کہ عرض کیا گیا۔ دولت کے اولین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں۔ لیکن عوامل پیداوار کی تعیین انکی اصطلاحات اور ان پر تقسیم دولت کے طریقے اسلام میں بعینہ وہ نہیں ہیں جو سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں مقرر کئے گئے ہیں۔ بلکہ بہت مختلف ہیں۔ اسلامی نظریے کے مطابق پیدائش کے حقیقی عوامل چار کی بجائے تین ہیں۔

- ۱۔ سرمایہ — یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انہیں خرچ نہ کیا جائے یا ان کی شکل و صورت میں تبدیلی نہ کی جائے۔ اور اس لئے ان کا کرایہ پر چلانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً نقد روپیہ یا اشیائے خورد و ذی وغیرہ۔
- ۲۔ زمین — یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ انکی اصلی شکل و صورت برقرار رہتی ہے۔ اور اس لئے انہیں کرایہ پر دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً زمین۔ مکان۔ مشینری وغیرہ۔

۳۔ محنت — یعنی انسانی فعل، خواہ وہ اعضاء و جوارح کا ہو، یا ذہن اور قلب کا۔ لہذا اس میں تنظیم اور منصوبہ بندی بھی داخل ہے۔

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی وہ اولاً انہی تینوں پر اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ اس کا ایک حصہ سرمایہ کو بہ شکل منافع (نہ کہ بشکل سود) ملے گا۔ دوسرا حصہ زمین کو بشکل کرایہ دیا جائے گا۔ اور تیسرا حصہ محنت کو بشکل اجرت۔

اشتراکیت اور اسلام | تقسیم دولت کا یہ نظام اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اور

سرمایہ داری سے بھی۔ اشتراکیت سے تو اس کا فرق بالکل ظاہر ہے۔ کہ اشتراکیت میں چونکہ انفرادی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس میں تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی نظریہ تقسیم دولت کے جو اصول ہم نے شروع میں بیان کئے ہیں، ان کی روشنی میں کائنات کی تمام اشیاء اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقف عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا ہے۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خود روگھاس، جنگل اور پانی کا شکار۔ معادن اور غیر مملوک بجز زمین وغیرہ اس قسم میں داخل ہیں، جن پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں۔ بلکہ وہ وقف عام ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور ان کا مساوی طور پر حقدار ہے۔

دوسری طرف بعض اشیاء وہ ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کئے بغیر وہ قابل عمل اور فطری نظم معیشت قائم نہیں ہو سکتا۔ جس کی طرف ہم نے تقسیم دولت کے پہلے مقصد میں اشارہ کیا ہے۔ اشتراکی نظام کو اختیار کرتے ہوئے تمام سرمایہ اور زمین کو کلیتہً حکومت کے حوالے کر دینے کا نتیجہ مال کا اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چھوٹے چھوٹے بیٹھارے سرمایہ داروں کو ختم کر کے ملکی دولت کے عظیم الشان ذخیرے کو ایک بڑے سرمایہ دار کے حوالہ کرنا پڑتا ہے۔ جو من مانے طریقے پر دولت کے اس تالاب سے کھیلتا ہے۔ اور اس طرح اشتراکیت کا نتیجہ بدترین ارتکاز دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے دوسری بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسانی محنت چونکہ اپنے اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کے استعمال کیلئے جبر و تشدد ناگزیر ہے جس کا برا اثر محنت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے۔ اور اسکی ذہنی صحت پر بھی، اس سے واضح ہو گیا کہ اشتراکی نظام میں اسلامی نظریہ تقسیم دولت کے دو مقاصد مجروح ہوتے ہیں، ایک فطری نظم معیشت کا قیام اور دوسرے حقدار کو حق پہنچانا۔

غرض اشتراکیت کے غیر فطری نظام کی ان چند در چند خرابیوں کی وجہ سے اسلام نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کر ڈالنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ کائنات کی جو اشیاء وقف عام نہیں ہیں، ان میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے اس نے سرمایہ اور زمین کی جداگانہ حیثیت بھی برقرار رکھی ہے اور ان میں ”رشد و طلب“ کے فطری نظام کو بھی صحت مند بنا کر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں ہوتی، بلکہ منافع اور کرایہ کی صورت

میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے ”سود“ کی مد کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست بنا کر ارتکاز دولت کی اس زبردست خرابی کو بھی ختم کر دیا ہے جو سرمایہ داری کا خاصہ لازمہ ہے۔ اور جسے دور کرنے کا دعویٰ اشتراکیت کرتی ہے۔

سرمایہ داری اور اسلام | یہ مختصر اسلامی نظریہ تقسیم دولت کا وہ بنیادی فرق جو اسے اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس فرق کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو سرمایہ داری اور اسلام کے نظام تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق چونکہ قدرے دقیق اور پیچیدہ ہے۔ اس لئے اسے نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہوگی۔

ادھر ہم نے اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت کے جو اجمالی خاکے پیش کئے ہیں ان کا تقابل کرنے سے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان مندرجہ ذیل فرق واضح ہوتے ہیں:

- ۱۔ عوامل پیداوار کی فہرست سے آجر کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اور صرف تین عوامل پیداوار تسلیم کئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آجر کے وجود سے انکار کیا گیا ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی الگ عامل نہیں بلکہ ان تین عوامل میں سے کسی نہ کسی میں شامل ہیں۔

۲۔ سرمایہ کا اصل ”سود“ کی بجائے ”منافع“ قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ عوامل پیدائش کی تعریفیں بدل دی گئی ہیں۔ ”سرمایہ“ کی تعریف سرمایہ دارانہ معیشت میں ”پیدا شدہ ذلیجہ پیدائش“ سے کی جاتی ہے۔ لہذا نقد روپیہ اور اشیائے خوردنی کے علاوہ مشینری وغیرہ بھی اس میں داخل ہے، لیکن ہم نے اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی توضیح کرتے ہوئے ”سرمایہ“ کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں جنہیں خرچ کئے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں، یا بالفاظ دیگر جنہیں کرایہ پر نہیں چلایا جاسکتا۔ مثلاً روپیہ۔ لہذا مشینری اس تعریف کی رو سے ”سرمایہ“ میں داخل نہیں۔

۴۔ اسی طرح ”زمین“ کی تعریف زیادہ عام کر دی گئی ہے۔ یعنی اس میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا گیا ہے جن سے استفادہ کئے لئے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ لہذا مشینری بھی اس میں داخل ہو گئی ہے۔

۵۔ محنت کی تعریف میں بھی زیادہ عموم پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں ذہنی محنت اور منصوبہ بندی بھی شامل ہو گئی ہے۔

(باقی آئندہ)

مغربی مستشرقین اور انکی تحقیقات کا اثر

تجدد اور مغربیت کا پس منظر

حضرت مولانا ابوالحسن علی سندوی



اس نصف صدی کے اند عالم اسلام میں اصلاح و ترقی (درحقیقت تجدد و مغربیت) کے جتنے علمبردار پیدا ہوئے ان کے خیالات، اعلانات اور ان کے طریقہ کار میں مستشرقین کی اس دعوت و تلقین کا عکس صاف نظر آئے گا، یہاں تک کہ مستشرقین کے ان خیالات کو ان مصلحین و زعماء کے فکر و عمل کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور اسکو ان کا مشترک منشور (MANIFESTO) کہا جاسکتا ہے۔

موجودہ عالم اسلام کے رہنما و حکمران طبقہ کے (جس نے عام طور پر اعلیٰ مغربی تعلیم گاہوں میں تعلیم پائی ہے، یا مغربی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے) دماغوں میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی، اس کے حال کی طرف سے بیزاری، اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی، اسلام و پیغمبر اسلام اور اسلامی مآخذ (sources) کے بارہ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور "اصلاح مذہب"، "اصلاح قانون اسلامی" پر آمادہ کرنے میں بہت بڑا حصہ ان علماء مغرب کا ہے جنہوں نے اسلامیات کے مطالعہ کے بجائے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں اور ان کو عام طور پر مستشرقین (ORIENTALIST) کہا جاتا ہے اور جو اپنے علمی تجربہ، تحقیقی انہماک اور مشرقیات سے گہری واقفیت کی بنا پر مغرب و مشرق کے علمی و سیاسی حلقوں میں بڑی عظمت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور ان مشرقی اسلامی مباحث و مسائل میں ان کی تحقیق و نظریات کو حرف آخر اور قول فیصل سمجھا جاتا ہے۔

اس استشرق کی تاریخ بہت پرانی ہے، وہ واضح طریقہ پر تیرھویں صدی سچی سے شروع ہو جاتی ہے، اس کے محرکات دینی بھی تھے، سیاسی بھی، اقتصادی بھی، دینی محرک واضح ہے،

اس کا بڑا مقصد مذہب عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئی نسل کے لئے مسیحیت میں کشش پیدا ہو، چنانچہ اکثر استشرق اور تبلیغ مسیحیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں، مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے، ان میں سے ایک بڑی تعداد نسلا و مذہباً یہودی ہے۔

سیاسی محرک یہ ہے کہ یہ مستشرقین عام طور پر مشرق میں مغربی حکومتوں اور اقتدار کا ہر اول دستہ (PIONEERS) رہے ہیں، مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہنچانا ان کا کام ہے، وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج، طریق ماند و بود اور زبان و ادب، بلکہ جذبات و نفسیات کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ تاکہ ان پر اہل مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو، اسی کے ساتھ ساتھ ان حالات و تحریکات، عقائد و خیالات کا ”تور“ کرتے رہتے ہیں۔ جو ان حکومتوں کے لئے پریشانی اور درد سر کا باعث ہیں، اور ایسی ذہنی اور علمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں ان حکومتوں کی مخالفت کا خیال ہی پیدا نہ ہونے پائے، اس کے بالمقابل ان کی تہذیب کی عظمت اور ان کی خدمات کی وقعت پیدا ہو اور اپنے ملک کی اصلاح و ترقی اور ان کو مغرب کے نقش قدم پر سے چلنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ ان مغربی حکومتوں کے ہٹ جانے پر بھی ان کا ذہنی اور تہذیبی اقتدار قائم رہے۔

اسی بنا پر مغربی حکومتوں نے مستشرقین کی اہمیت و افادیت کو پوری طرح محسوس کیا اور ان کے سربراہوں نے ان کی پوری سرپرستی کی، اور اسی مقصد کے ماتحت مختلف ممالک کے مستشرقین عالم اسلام سے متعلق مختلف رسائل اور مجلات شائع کرتے ہیں جن میں عالم اسلام کے مسائل اور رجحانات پر مبصرانہ تبصرہ اور ماہرانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی رسالہ ”مشرق اوسط“ (JOURNAL OF NEAR EAST) اور مجلہ ”عالم اسلامی“ (THE MUSLIM WORLD) امریکہ سے نکلتے ہیں اور (LEMONDE MUSALMANS) فرانس سے نکلتے ہیں۔

ان اہم مذہبی و سیاسی محرکات کے علاوہ قدرتی طور پر استشرق کا ایک محرک اقتصادی بھی ہے، بہت سے فضلا اس کو ایک کامیاب پیشہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں، بہت سے ناشرین اس بنا پر کہ ان کتابوں کی جو مشرتبایات اور اسلامیات پر لکھی جاتی ہیں، یورپ اور ایشیا میں بڑی منڈی ہے۔ اس کام کی بہت افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں۔ اور بڑی سرعت کے ساتھ یورپ و امریکہ میں ان موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں، جو بہت بڑی مالی منفعت اور کاروبار کی ترقی

کا فہرستہ ہیں۔

ان مقاصد کے علاوہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض فضلاء مشرقیات و اسلامیات کو اپنے علمی ذوق و شغف کے ماتحت بھی اختیار کرتے ہیں اور اس کے لئے اس دیدہ ریزہ دماغ سموزی اور جفاکشی سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے دینا ایک اخلاقی کوتاہی اور علمی ناانصافی ہے، ان کی مساعی سے بہت سے مشرقی و اسلامی علمی جواہرات و نوا در پردہ خفا سے نکل کر منظر عام پر آئے اور جاہل و اراذل اور ظالم کیرلوں کی دست برد سے محفوظ ہو گئے۔ متعدد اعلیٰ اسلامی مآخذ اور تاریخی وثائق ہیں جو ان کی محنت و ہمت سے پہلی مرتبہ شائع ہوئے اور مشرق کے اہل علم نے اپنی آنکھوں کو ان سے روشن کیا۔ اس علمی اعتراف کے باوجود اس کے کہنے میں باک نہیں کہ مستشرقین عمومی طور پر اہل علم کا وہ بدقسمت اور بے توفیق گروہ ہے جس نے قرآن و حدیث، سیرت نبوی، فقہ اسلامی اور اخلاق و تصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے اور بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آیا، بلکہ اس سے اس کا عناد، اسلام سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ اور بڑھ گیا، اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں، عام طور پر ان مستشرقین کا مقصد کمزوریوں کا تلاش کرنا اور دینی یا سیاسی مقاصد کے ماتحت ان کو نمایاں کرنا اور چمکانا ہوتا ہے، چنانچہ صفائی کے انسپکٹر کی طرح ان کو ایک گلزار و جنت نشان شہر میں صرف غیر صحتمند مقامات ہی نظر آتے ہیں۔

مستشرقین کی محرومی صرف انکی ذات تک محدود نہیں، اگر تنہا یہ پہلو ہوتا تو وہ ہماری توجہ کا مرکز اور ہماری اس بحث کا موضوع نہ ہوتا، مسئلہ کا زیادہ سنگین اور دور رس پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو معقول و غیر معقول طریقہ پر ان کمزوریوں کی نشاندہی اور ان کو نہایت مہیب شکل میں پیش کرنے میں صرف کرتے ہیں، وہ خود بین سے دیکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو دور بین سے دکھاتے ہیں، رانی کا پریت بنانا ان کا ادنیٰ کام ہے۔ وہ اپنے اس کام میں (یعنی اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں) اس سبک دستی، ہنرمندی اور صبر و سکون سے کام لیتے ہیں جسکی نظیر ملنی مشکل ہے۔ وہ پہلے ایک مقصد تجویز کرتے ہیں۔ اور ایک بات طے کر لیتے ہیں کہ اس کو ثابت کرنا ہے۔ پھر اس مقصد کے لئے ہر طرح کے رطب و یابس، مذہب و تاریخ

۱۔ طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، تاریخ کامل ابن اثیر، انصاب سمعانی، فتوح البلدان بلاذری،

کتاب الہند البیرونی وغیرہ پہلی مرتبہ یورپ سے شائع ہوئیں پھر ان کے متعدد ایڈیشن مصر سے نکلے۔

ادب، افسانہ، شاعری، مستند و غیر مستند ذخیرہ سے مواد فراہم کرتے ہیں۔ اور جس سے ذرا بھی ان کی مطلب برآدی ہوتی ہو (خواہ وہ صحت و استناد کے اعتبار سے کتنا ہی مجروح و مشکوک اور بے قیمت ہو) اس کو بڑے آب و تاب سے پیش کرتے ہیں۔ اور اس متفرق مواد سے ایک نظریہ کا پورا ڈھانچہ تیار کر لیتے ہیں جس کا اجتماعی وجود صرف ان کے ذہن میں ہوتا ہے، وہ اکثر ایک برائی بیان کرتے ہیں۔ اور اس کو دعاغول میں بھٹانے کے لئے بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے ممدوح کی دس خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کا ذہن ان کے انصاف، وسعت قلب اور بے تعصبی سے مرعوب ہو کر اس ایک برائی کو (جو تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے) قبول کرے، وہ کسی شخصیت یا دعوت کے ماحول، تاریخی پس منظر، قدرتی و طبعی عوامل و محرکات کا نقشہ ایسی خوبصورتی اور عالمانہ انداز سے کھینچتے ہیں (خواہ وہ محض خیالی ہو) کہ ذہن اس کو قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں وہ اس شخصیت و دعوت کو اس ماحول کا قدرتی رد عمل یا اس کا فطری نتیجہ سمجھنے لگتا ہے۔ اور اس کی عظمت و تقدس اور کسی غیر انسانی سرشت سے اس کے اتصال و تعلق کا منکر بن جاتا ہے، اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں "زہر" کی ایک مناسب مقدار رکھتے ہیں۔ اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور پڑھنے والے کو متفرق اور بدگمان نہ کر دے، ان کی تحریریں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں اور ایک متوسط آدمی کا ان کی زد سے بچ کر نکل جانا مشکل ہے۔

قرآن، سیرت نبوی، فقہ و کلام، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین و فقہاء، مشائخ و صوفیہ، رواۃ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کے مآخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہرائی نظر رکھتا ہو، پورے اسلام سے منحرف کر دینے کے لئے کافی ہے، اس کا علمی جائزہ لینا، ان کی تحریفات، فنی غلطیوں اور ان کے دجل و تبلیس کو واضح کرنا اس وقت ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے، یہ ایک اہم علمی موضوع اور عظیم الشان دینی خدمت ہے جس کے لئے ایک عظیم و منظم ادارہ کی ضرورت ہے۔

یہاں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان کی اس دعوت و تلقین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ جو وہ اپنے پڑھے لکھے حوصلہ مند اور ترقی پسند نوجوان قارئین کے سامنے بار بار اور مختلف عنوانوں سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور جس کو ان نوجوانوں کا ذہن ایک معقول اور بدیہی حقیقت کی طرح قبول

کرتا چلا جاتا ہے، اس دعوت و تلقین کا اسلامی ممالک کی اصلاح و ترقی کی تحریکات سے قریبی تعلق ہے اور ان کی نوعیت کا اندازہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس موقع پر ہم اس خلاصہ کو بطور اقتباس پیش کرتے ہیں، جو ایک مصری فاضل (ڈاکٹر محمد البجٹی) نے اپنی فاضلانہ کتاب "الفکر الاسلامی الحدیث" میں پیش کیا ہے۔ اور جو اکثر و بیشتر مستشرقین کی کتابوں کا قدر مشترک اور ان کے خیالات کا عکس ہے۔

— اسلامی معاشرہ کی وابستگی اسلام کے ساتھ صرف ایک مختصر وقفہ میں مستحکم رہی، یہ وہ تاریخی وقفہ ہے جبکہ اسلامی معاشرہ ابتدائی حالت اور دور طفولیت میں تھا، اس ابتدائی حالت اور دور طفولیت نے اس کا موقع دیا کہ زندگی اور اسلامی تعلیمات میں مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے، لیکن اس مختصر ابتدائی وقفہ کے ختم ہوتے ہی اسلامی معاشرہ اور اسلام کے درمیان غلیج پڑ گئی اور اسلام زندگی کی رہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہا۔ کچھ سیاسی، اقتصادی اور دوسرے خارجی عوامل کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر زندگی یقینی تبدیل ہوتی رہی اور ترقی کرتی رہی، اتنا ہی اسلام اس بدلتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتا چلا گیا، یہ غلیج بلاواسطہ ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ خلافت اسلامی کے آخری مرکز (جدید ترکی) نے اس کا اعلان کر دیا کہ اسلام اب عام زندگی میں دخل نہ دے سکے گا۔ اور اب اسکی جگہ فرد کے ضمیر میں ہوگی اور یہ فرد بغیر کسی انظر اور جوش کے اپنی ذات کے لئے اس کا انظار کر سکیگا۔ اسلامی تعلیمات کا نافرمان نہ کر سکتا، اجتماعی ضرورت کا عین تقاضا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے۔ روز بروز بدلتی ہوئی زندگی کے ان حالات کا جن کو اسلام اپنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مطابق نہیں بنا سکا اور ان کے اور اپنی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکا، اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنی اس زمانہ میں اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ تمدن جدید کے مسائل سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان دنیا سے پیچھے رہ جائیں مسلمان ممالک میں غربت، بیماریوں اور بے ہمتی کو بخوشی گوارا کیا جائے۔ جیسا کہ اس وقت سعودی حکومت میں حال ہے، یہ وہ تنہا اسلامی ملک ہے جس نے سرکاری طور پر اسلام پر عمل کیا ہے، اس نے وہ اس بات کا نوہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ سابق ڈاکٹر شعبہ ثقافت اسلامی حکومت مصر و حال وزیر اوقاف جمہوریہ عربیہ متحدہ۔

۲۔ الفکر الاسلامی الحدیث ص ۱۵۱ ۳۔ الفکر الاسلامی الحدیث ص ۱۵۲

تغیر و ترقی جو زندگی کا ایسا عام قانون ہے جس سے مغربین، مسلمانوں کو اپنے اسلام کے بارے میں بھی اس سے کام لینا چاہئے تاکہ وہ جدید مغربی دنیا کے قدم بہ قدم چل سکیں اور کمزوری و بد نظمی کے اسباب سے نجات پاسکیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود اسلام پر بھی بحیثیت ایک مذہب کے اس قانون کو نافذ کریں اور اس کو زمانہ کے ساتھ بدلنے اور ترقی دینے کی کوشش کریں، ملت اسلامیہ کو بھی تغیر و ترقی کے اس فطری اور ابدی قانون کی پیروی میں مغربی معیار (IDEAL) کے مطابق چلنا اور اپنے مشرقی ماحول میں اس سے متاثر ہونا ضروری ہے۔

اس لئے کہ فکر و زندگی کے میدان میں اہل مغرب کے رجحانات طویل انسانی تجربوں کا نتیجہ ہیں، اہل مغرب نے ان رجحانات کی تشکیل میں علمی اور سائنٹفک طریقہ استعمال کیا، یہ طریقہ ادیان و خرافات اور مخصوص عقائد سے متاثر نہیں ہوتا، اس کے پیش نظر صرف انسانیت کی فلاح ہوتی ہے۔۔۔۔۔

تقریباً ڈیڑھ دو صدی کے طویل و مسلسل تجربہ کے بعد مستشرقین نے محسوس کیا کہ ان کے طریق کار میں بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے ان کی جدوجہد کا پورا نتیجہ نہیں نکل رہا تھا، اور بعض اوقات اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں شدید رد عمل اور اشتعال پیدا ہو جاتا تھا جو تبلیغی و دعوتی نقطہ نظر سے خطرناک تھا، وہ برابر اپنی مساعی اور ان کے اثرات و نتائج کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے رہے، اب ان نتائج کی روشنی میں انہوں نے غے کیا کہ ان کو اپنے رویہ اور طریق کار میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی چاہئے، اور بجائے مسلمانوں کو بدلنے کی کوشش کے اسلام کی جدید تعبیر پیش کرنے اور اصلاح مذہب (REFORM) کی تحریک چلانی چاہئے اور جہاں جہاں تجدید و اصلاح مذہب کی تحریک چل رہی ہے۔ اسکی ہمت افزائی اور تائید کرنی چاہئے، اس ذہنی تبدیلی اور ایک نئے طریق کار کی حسب ذیل اقتباس سے بخوبی نشانہ ہی ہوتی ہے،

HARRY GAYLORD DORMAN

اپنی کتاب TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM میں لکھتا ہے :-

”اسلامی تحریکیں، دینی تعلیمات کی موجودہ تجربوں کی روشنی میں از سر نو تشریح کرنے کی غصانہ کوششیں ہوتی ہیں یا ان کے ذریعہ نئے تجربوں کو دینی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس لئے وہ (مسیحیت کے) ایک مبلغ کے لئے اولیں اہمیت

رکھتی ہیں۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ہر نئی تحریک جس کو کہ چند خطی شروع کر دیں وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ کہ اس کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے، ہماری مراد ان تحریکوں سے ہے جن کی حیثیت موجودہ زندگی کے سچے دینی اظہار کی ہے اور جو روزمرہ کے تجربہ کی روحانی تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور جو جاری ہیں اور جس میں روحانی قوتیں حقائق سے نبرد آزما ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے ایک اصلاحی تحریک مسلمانوں کے حضرت عیسیٰ کو سمجھنے کے سلسلہ میں بالآخر بری ایم ثابت ہو، حتیٰ کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں اسلامی ممالک میں (سچی) مبلغ کا اصل کارنامہ مسلمان افراد کی اصلاح و احیاء سے زیادہ خود اسلام کی تجدید و احیاء ہوئے۔ ہر حال یہ کام کا ایک میدان ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور جس سے غفلت نہیں برتی جاسکتی، یہ میدان کھلا ہوا ہے، یہ ان معذرت پسندوں کی مثال سے ظاہر ہے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ۴

اس نصف صدی کے اندر عالم اسلام میں اصلاح و ترقی (درحقیقت تجدید و مغربیت) کے جتنے علمبردار پیدا ہوئے ان کے خیالات، اعلانات اور ان کے طریقہ کار میں مشرقین کی اس دعوت و تلقین کا عکس صاف نظر آئے گا، یہاں تک کہ مشرقین کے ان خیالات کو ان مصلحین و زعماء کے فکر و عمل کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور اس کو ان کا مشترک منشور MANIFESTO کہا جاسکتا ہے۔ ان مشرقین نے ایک طرف اسلام کے دینی افکار و اقدار کی تحقیر کا کام کیا اور سچی مغرب کے افکار و اقدار کی عظمت ثابت کی اور اسلامی تعلیمات و اعمول کی ایسی تشریح پیش کی کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو اور ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جائے اور وہ اسلام کے بارے میں تشکک ہو جائے، کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ ساز نہیں کرتا اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے، ایک طرف انہوں نے بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ کا نام لے کر خدا کے آخری اور ابدی دین اور قانون پر عمل کرنے کو روایت پرستی، رجعت پسندی اور قدامت و دقیانوسیت

۴ یہ تجدید و احیاء ظاہر ہے کہ ان مشرقین کے اصول و معیار کے مطابق ہی ہوگا اور یہ درحقیقت تجدید کے بجائے تحریف و تجدد کا عمل ہے جو تقریباً تمام اسلامی ممالک میں شروع ہو گیا ہے۔

کا مراد فساد قرار دیا، دوسری طرف اس کے بالکل برعکس انہوں نے ان قدیم ترین تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کی دعوت دی جو اپنی زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے طبع کے نیچے سیکڑوں ہزاروں برس سے مدفن میں ہیں اور جن کے احیاء کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کر سنے، اس سنانی مذہب کو پارہ پارہ کر سنے، اسلامی تہذیب اور عربی زبان کو نقصان پہنچانے اور جاہلیتِ قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، چنانچہ انہی کی تحریروں کے اثر اور انہی کے شاگردانِ رشید کے ذریعہ مصر میں ”فرعونی“، عراق میں ”آشوری“، شمالی افریقہ میں ”بربری“، فلسطین و لبنان کے ساحل پر ”فنیقی“ تہذیب و زبان کے احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں اور ان کے مستقل داعی پیدا ہو گئے، انہی مستشرقین اور ان کے شاگردوں نے شد و مد کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا کہ قرآنی عربی زبان ”فصحی“ اس زبان کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی، اس کے بجائے عامی (colloquial) اور مقامی زبانوں کو رواج دینا چاہیے اور انہی کو اخبارات اور کتابوں کی زبان بنانا چاہیے، یہ بات انہوں نے اتنی خوبصورتی سے اور اتنے بار کہی کہ مصر میں اچھے پڑھے لکھے اور صاحبِ قلم لوگوں نے اس تحریک کی حمایت شروع کر دی جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہر ملک اور ہر صوبہ کی الگ الگ زبان ہو جائے۔ قرآن مجید اور اسلامی ادب سے عرب قوموں کا رشتہ کٹ جائے اور وہ ان کے لئے ایک اجنبی زبان بن جائے، عربی زبان اپنی بین الاقوامی حیثیت ختم کر دے اور عرب اس پورے دینی سربراہ اور روح سے محروم ہو کر الحاد و ارتداد اور اختلاف و انتشار کے نذر ہو جائیں۔

اسی طرح انہوں نے عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط (ROMAN CHARACTER) کے اختیار کرنے کی دعوت دی اور ان کے تلامذہ نے وقتاً فوقتاً اس کی ضرورت ثابت کی اور اس کے فوائد و فضائل بڑی بلند آہنگی سے بیان کئے، اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ پوری عرب قوم صحیح طور پر قرآن مجید پڑھنے سے محروم و نا آشنا ہو جائے اور وہ پورا علمی ذخیرہ (جو اپنی وسعت اور علمی قیمت میں بے نظیر ہے) بے معنی اور بیکار ہو کر رہ جائے۔

ان تجاویز اور مشوروں سے مستشرقین کے قبیح مقاصد و خیالات، ان کی دودھنی اور ان کی

سے سلام برسی اس تحریک کا خاص طبع دار تھا، محمد حسین، یکن، احمد امین اور احمد حسن الزیات بھی جزوی طور پر ان کے حامی تھے۔

اسلام دشمنی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے، ان میں سے اکثر کی تصنیفات اسلام کی بنیادوں پر ہمیشہ چلاتی ہیں، اسلامیات کے سرچشموں (بشمول حدیث و فقہ) کو مشکوک قرار دیتی ہیں، مسلم معاشرہ میں سخت ذہنی انتشار اور تشکک وارتباب پیدا کرتی ہیں، اسلام کے عاملین و شارحین (محدثین و فقہاء) کی علمیت و ذہانت کی طرف سے تشکک بناتی ہیں، فاضل علمی غلطیوں، مضحکہ خیز غلط فہمیوں، زبان و قواعد سے ناواقفیت اور بعض اوقات کھلی تحریفات کی ان میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں، لیکن ان کی اکثریت بیشتر تصنیفات مغربی و مشرقی دنیا میں مقبول ہیں، نیا تعلیم یافتہ طبقہ (جس میں سن رسیدہ اہل علم کی بھی ایک تعداد شامل ہے) اس کی حسن ترتیب، طرز استدلال، نتائج کے استنباط اور پیش کرنے کے علمی (سائنٹفک) طریقہ سے مرعوب و مسحور ہے اور اس کی تشفی خالص علمائے مشرق کی تصنیفات سے نہیں ہوتی، مغربی علمائے مشرقیات جس وقعت و اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور انہوں نے مشرق میں جو مقام حاصل کر لیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کی تینوں موقر مجالس علمیہ (ACADEMIES) المجمع اللغوی (مصر) المجمع العلوی العرबी (شام) المجمع اللغوی البحرانی (بغداد) میں مستشرقین کی ایک خاص تعداد رکن ہے اور ان کے مطالعہ و آراء سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

عالم اسلام اور عالم عربی کی بے مانگی و کم ہمتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خالص اسلامی و عربی موضوعات پر بھی عرصہ دراز سے مستشرقین ہی کی کتابوں پر دار و مدار ہے۔ اور وہ اپنے موضوع پر ایک طرح سے کتاب مقدس (GOSPEL) کی حیثیت رکھتی ہیں، تاریخ ادبیات عرب پر نکلسن (R.A. NICHOLSON) کی کتاب A LITERARY HISTORY OF ARABIC LITERATURE، تاریخ عرب و اسلام پر نکلسن (P.H. NITZI) کی کتاب HISTORY OF ARABIC LITERATURE، تاریخ ادبیات اسلامیہ پر بروکلیمان (CARL BROCKLEMAN) کی کتاب GESCHICHTE DER ARABISCHEN LITERATURE، اور اس کا انگریزی ترجمہ (THE HISTORY OF ARAB LITERATURE) اسلامی قانون پر شناخت (SCHACHT) کی کتاب (THE ORIGINS OF MUHAMMADAN JURISPRUDENCE) اپنے اپنے موضوع پر منفرد سمجھی جاتی ہے اور بیشتر مشرقی جامعات میں شعبہ عربی و اسلامیات میں ان کی حیثیت ایک علمی مرجع (REFERENCE BOOK) اور سند (AUTHORITY) کی ہے۔ مستشرقین کا مرتب کیا ہوا دائرۃ المعارف الاسلامیہ (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM) جس کے متوزع ایڈیشن یورپ و امریکہ سے نکل چکے ہیں اور جن میں برائے نام مسلمان مقالہ نگاروں کی ایک تعداد بھی شامل ہے اسلامی معلومات و حقائق کا سب سے بڑا اور مستند ذخیرہ سمجھا جاتا ہے اور مصر و پاکستان میں اسی کو بنیاد بنا کر عربی اور اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کی اصلاح اور مستشرقین کی تخریبی و تشکیلی اثرات کو روکنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ان علمی موضوعات پر مسلمان محققین و اہل نظر قلم اٹھائیں اور مستشرقین کی ان تمام قابل تعریف خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلکہ ان کو ترقی دیتے ہوئے جو ان کا حصہ سمجھی جاتی ہیں، مستند و مستند اسلامی معلومات اور نقطہ نظر پیش کریں، یہ ایسی تصنیفات ہوں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت (ORIGINALITY) مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی اور عمق، مآخذ کے استناد و صحت اور اپنے حکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق و ممتاز ہوں، ان میں ان کی تمام خوبیاں ہوں، اور وہ ان کی کمزوریوں اور عیوب سے پاک ہوں، دوسری طرف ان مستشرقین کی کتابوں کا علمی محاسبہ کیا جائے اور ان کی تبلیغات کو بے نقاب کیا جائے، متن کے سمجھنے میں ان کی غلط فہمیوں اور ترجمہ و اخذ مطلب میں ان کی غلطیوں کو واضح کیا جائے، ان کے مآخذ کی کمزوری اور ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج کی غلطی کو روشن کیا جائے، اور ان کی دعوت و تلقین میں ان کی جو بدعتی، مذہبی اغراض اور سیاسی مقاصد شامل ہیں ان کو طشت از بام کیا جائے اور بتایا جائے کہ یہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف کیسی گہری اور خطرناک سازش ہے۔

اس پہلے مثبت و ایجابی کام (اسلامی موضوعات پر تصنیف) اور اس دوسرے سلبی و جوابی بزور (علمی محاسبہ) کے بغیر دنیا کے اسلام کا ذہن و حوصلہ مندرجہ ذیل یورپ و امریکہ کی بلند پایہ یونیورسٹیوں یا اپنے ملک کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں تعلیم پاتا ہے۔ اور مغربی زبانوں ہی میں (جن میں وہ زیادہ مہارت رکھتا ہے) اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، مستشرقین کے زہر آلود خیالات کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتا، اور جب تک اس اثر سے آزاد نہ ہو اسلامی ممالک برابر فکری انتشار اور ذہنی ارتداد کے خطرہ سے دوچار رہیں گے اور ان ممالک میں تجدید و مغربیت کے علمبردار برابر ان خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے اور جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا تو ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں گے جو اسلام کی روح کے منافی ہیں اور ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں جو صرف نسل و قومیت میں قدیم اسلامی معاشرہ سے مشابہت رکھتا ہے، اور جس کا رخ مغرب اور خالص مادیت کی طرف ہوگا، اور جس کو دیکھ کر کم سے کم عالم اسلام کے اہل فضلہ اور رہنماؤں سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

ترسم ندسی بکھسبہ اسے اُطرائی
کیں رہ کہ تو میری بترکستان است